حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرّانی

باب نمبر ۶

سُہاگ

بابا قادر قبلہ وجے نگرم لوٹ آئے۔ وہی گھر، وہی اعزا، وہی دن اور وہی رات۔ مگر دنیا کس قدر بدلی ہوئی تھی۔ اب ہر کوئی یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ الٹھر لڑکا نہیں ہے۔ یہ بلاشبہ بابا ہیں۔ ان کے ساتھی بھی جو بچپن میں ساتھ کھیلتے تھے بجائے نام لینے کے حضرت کہہ کر پکارتے تھے۔ کچھ دنوں تک اپنے آبائی مکان میں قیام فرمایا۔ پھر وہیں ایک جھونپڑی ڈال کر رہنے لگے۔ لوگ ملاقات کے لئے آتے تھے مگر آپ بہت کم بولتے تھے۔ اور زیادہ تر اوکڑوں سر کو گھٹنوں میں دبائے ہوئے جس طرح بابا تاج الدین بیٹھا کرتے تھے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ سر کے بال، داڑھی، مونچھ اور ناخن اپنی رفتار سے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ سردی ہو یا گرمی۔ دن ہو یا رات۔ ایک ہی عالم تھا۔ کون سا آفتاب سایا تھا جس کی گرمی سے ہر وقت پسینہ میں ڈوبے ہوئے رہتے تھے اور جھونپڑی میں جو بھی کوئی داخل ہوتا تھا سہم کر چُپ ہو جاتا تھا۔ کوئی چونکا کر چائے پیش کر دیتا تو پی لیتے اور بہت مجبور کرتا تو ایک آدھ لقمہ چاول کا منہ میں ڈال لیتے اور دوسرے چوتھے دن کمبلی روڈ پر اس بڑ کے نیچے جہاں آپ کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی تھی جا کر بیٹھ جاتے۔

بڑ کے درخت کو ایک سادھو نے نشانی کے طور پر کوئی بیس سال قبل لگایا تھا جو قریب ہی کے پھول باغ میں رہتا تھا۔ وہاں کے مالی کا کہنا ہے کہ اس سادھو نے پیشین گوئی کی تھی کہ ”یہ جگہ بالکل بدل جائے گی۔ اس جنگل پر جو درندوں کی وحشت اور قہر برس رہا ہے وہ شانتی، امن اور روشنی سے بدل جائے گا۔ میں تو نہیں رہوں گا مگر میری عقیدت کی نشانی ایک بڑ کا درخت ہو گا جسے لگا کر جا رہا ہوں۔“ اس نے مالی کو ہدایت کر دی تھی کہ جب تک وہ پیڑ جڑ نہ پکڑ لے تم اس کو پانی دیتے رہنا۔ سادھو تو چلا گیا مگر وہ پیڑ ایک گنجان درخت ہو گیا ہے۔

جو مقام آج قادر نگر کہلاتا ہے اور جہاں اج بجلی کے قمقمے جگمگاتے ہیں، پکی سڑک بنی ہوئی ہے اور لوگوں کی قطار در قطار آتی جاتی ہے وہ ۱۹۲۲ء سے پہلے یعنی جب سے حضرت بابا قادر قبلہ نے اسے اپنا مسکن بنایا عجب جگہ تھی۔ اس زمانہ میں وجیا نگرم شہر کے شمال مشرق میں پرانی اور خستہ شاہی زمانہ کی بنی ہوئی ایک سڑک تھی جو آگے پہاڑیوں کے گھاٹ سے گزر کر سمندر کی طرف جاتی تھی۔ یہ غالباً اگلے بادشاہوں کی شاہراہ تھی مگر صدیوں کی غفلت سے خستہ ہو چکی تھی اور بیل گاڑی بھی اس پر مشکل سے چل سکتی تھی۔ وجیا نگرم کا شہر چھوڑ کر بائیں ہاتھ پر مرگھٹ اور بڑی بڑی چٹانوں کی پہاڑیاں اور اس میں چپل سین (ناگ پھنی) کے جھنڈ

اور خاردار جھاڑیوں کے جنگل اور سانپوں کے اونچے اونچے پٹے جگہ جگہ نظر آتے تھے۔ دائیں ہاتھ پر بھی ایسا ہی جنگل تھا اور کچھ آگے بڑھ کر تقریباً میل دو میل کے فاصلہ پر اسی بڑ کے درخت کے پاس اونچی اونچی لمبی چٹانوں کی تین صفیں تھیں۔ درمیانی چٹان پر بابا صاحب قبلہ نے اپنا مسکن بنایا تھا۔ آس پاس کانٹوں کا ایسا گھنا جنگل تھا کہ ایک خرگوش کا بھی گذر مشکل تھا۔ سانپ اور بڑے بڑے کالے بچھوئوں کی اتنی کثرت تھی کہ دن دہاڑے اگر کوئی شخص وہاں بیٹھ جائے تو بچھو اس کا پیر کتر کر کھا جاتے تھے۔ شام ہوئی نہیں کہ گیدڑوں کی پکار اور بھیڑیوں کا شور۔ دو فرلانگ پر شیر کی دھاڑیں۔ قوی سے قوی آدمی کا دل دہلانے کے لئے کافی تھیں۔ اس کے علاوہ اس سڑک پر ارواحِ خبیثہ اور جنوں کے واقعات اتنے مشہور تھے کہ ہمت والے بہادر بھی گھبراتے تھے۔

ایسے جنگل میں جو وحشت اور خوف، تاریکی اور دہشت کا مرکز تھا سیدھے سادے بھولے بھالے نوعمر بابا صاحب جو کبھی اپنے گھر میں سر شام پیشاب کی خاطر اپنے باپ کا ہاتھ پکڑے بغیر باہر نہ نکلتے تھے، قیام فرما ہوئے تھے۔ وہ کون سی طاقت تھی اور کون سا یقین تھا جس نے آپ کو وہاں قیام کے لئے نڈر بنا دیا تھا۔ کیا بابا صاحب اپنی قوت سے ان طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی قوت و ہمت رکھتے تھے یا فطرت کا نیست کرنے والی طاقتوں سے لڑائی کرنے کے لئے آئے تھے، یا صرف رضائے الٰہی کے آگے سر جھکا کر توکل کی زندگی اختیار کر کے سکون کے ساتھ رہنے کے لئے۔ اس کا فیصلہ مشکل نہیں ہے۔ فقیر کے دل میں ماسوا کی گنجائش نہیں رہتی۔ پھر کیسے سانپ اور کیسے شیر اس کا دل محبت سے پُر ہوتا تھا۔ اس میں خوف کی گنجائش ہی کہاں۔ ایک دفعہ جب اس کا دل جاگ جاتا ہے تو ہر چیز کو چاہے وہ ارواحِ خبیثہ ہی کیوں نہ ہوں خدا کی مخلوق سمجھ کر یگانگی کی نظر سے دیکھتا ہے اور کوئی غیریت محسوس نہیں کرتا۔ جو شخص اس کیفیت سے خالی ہوتا ہے اس کی مادی فطرت تقاضہ کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم و جان کی حفاظت کرے اور خطرات سے بچے مگر جو شخص مشغول ہو جس کی نس نس اور روئیں روئیں سے یاھُو کے نغمے پھوٹتے ہوں اس کو بھلا ان چیزوں کا کیا خوف اور کیا خیال۔

بابا صاحب قبلہ تقریباً دو سال تک ناگپور سے لوٹنے کے بعد رات کو اپنے گھر میں قیام فرماتے تھے۔ بچپن کے دو چار ساتھی آپ کے ساتھ ہر وقت لگے رہے۔ جب آپ مکان پر تشریف فرما ہوتے تو بہت سے اہلِ غرض قدم بوسی کو آتے اور بلا امتیاز ہر ایک کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور فرماتے۔ زبان کی تھی شمشیر برہنہ تھی۔ جس کے لئے جو کچھ کہا وہ ہو کر رہا مگر جیسا کہ ہوتا آیا ہے اپنوں سے زیادہ غیر ہی فیض اٹھاتے ہیں۔ اپنوں میں یقین کا پیدا ہونا مشکل ہے کہ اپنے ہی ساتھ کا ایک شخص ولی اللہ ہو گیا ہے اور کرامتیں اس کے قدم چومتی ہیں۔ دو سال کے بعد بابا صاحب مستقل اس چٹان پر رہنے لگے جہاں کبھی کبھی جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ دھوپ سے بچانے کے لئے ساتھیوں نے پتھر میں ایک سوراخ کر کے ایک تاڑ پان کی چھتری نصب کر دی تھی۔ اس سے ذرا آگے اسی چٹان پر بیٹھنے کی ذرا سی جگہ تھی جس پر شام کے وقت آپ پائوں لٹکا کر بیٹھا کرتے تھے اور خادموں نے اکثر دیکھا کہ کالے بچوں نیچے سے

پائوں کتر کر کھاتے رہتے۔ رات کے وقت آپ کے پاس صرف دو خادم رہتے۔ ایک کا نام تھانارائن رائو اور دوسرے کا محبوب۔ یہ دونوں عالمِ جوانی میں انتقال کر گئے۔

آس پاس کی پہاڑیوں میں گنوڑ کے سنگ تراشوں کی ٹولیاں پتھر نکالنے کے لئے آتی تھیں۔ ان لوگوں میں سے ایک شخص نے آپ کو دیکھ کر کہا کہ اجازت ہو تو میں انہیں پتھروں کے چار ستون بنا دوں اور اس چٹان میں نصب کر دوں۔ ان پر پاس کے جنگلوں سے تاڑپان اور بانس لا کر ایک جھونپڑی بھی بنائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آپ اسی جھونپڑی میں دن بھر پڑے رہتے۔ صبح کے وقت شہر کے بہت سے لوگ آتے اور پاس کی سڑک پر قطار میں بیٹھے رہا کرتے۔ آپ کو جھونپڑی سے کوئی اُٹھا کر اگر لے جاتا تھا تو چلے جاتے اور بیٹھے ہوئے لوگوں کی غرض سُن کر دعا فرما دیتے۔ پھر دس پندرہ منٹ کے بعد جھونپڑی میں آ کر لیٹ جاتے۔ آپ کے پاس صرف غرباء آتے اور اپنی مصیبتوں کا علاج پا کر خوش خوش چلے جاتے۔ شہر کے مسلمان خصوصاً مولوی اور پڑھے لکھے لوگ بھول کر اس طرف کا رُخ نہ کرتے بلکہ کبھی ذکر بھی آ جاتا تو قہقہہ لگا کر کہتے کہ دیکھو تو ہمارے سامنے کا لڑکا بابا بن گیا ہے۔ ہم نے ایسے بابا بہت دیکھے ہیں۔

کھانا صرف ایک وقت آپ کی والدہ صاحبہ کے پاس سے ایک چھوٹی سی پیالی میں آتا۔ جو ایک خادم دن کے وقت لایا کرتا۔ یہ تکلیف آپ کو جان بوجھ کر دی جاتی تھی تا کہ آپ اس زندگی سے باز آئیں اور گھر میں دنیادار کی طرح زندگی بسر کریں۔ اس پیالی میں سے ایک آدھ لقمہ آپ کھا لیتے اور باقی آپ کے خادم کھا کر پڑ رہتے البتہ کوئی گوالا اُدھر سے گزرتا اور عقیدت سے دودھ پیش کرتا اور کسی کی لائی ہوئی چائے کی پڑیا بھی ہوتی تو آس پاس کے جھاڑوں سے تنکے جمع کر کے چائے بنائی جاتی تھی۔ جس میں سے بابا صاحب ایک دو گھونٹ پی لیتے اور باقی سے خادم سیر ہوتے۔ یہی توکل کی زندگی تھی۔ اللہ ہی اللہ تھا اور کچھ نہ تھا۔ کلمہ طیبہ پڑھنا کمال نہیں بلکہ خود کلمہ طیب ہو جانا کمال ہے۔ فقیر گو ظاہر میں کلمہ نہ پڑھتا ہو، باطن میں خود کلمہ ہو جاتا ہے جو اسی مٹی کے پتلہ کو طیب بنا دیتا ہے۔

اسی زمانہ کا حال ہے کہ تقریباً چھ ماہ تک سخت خونی پیچش میں مبتلا رہے۔ نہ کوئی دوا تھی اور نہ دارو اور وہ جو دو ایک لقمہ غذا تھی وہ بھی نہ رہی۔ کبھی تھوڑی سی چائے کا سامان ہو گیا تو پی لی ورنہ وہ بھی نہیں۔ اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک ایسا سخت ملیریا رہا کہ ایک گھونٹ چائے بھی آنتیں گوارا نہ کرتی تھیں۔

بخار کی سخت شدت میں تھوڑا سا پانی ضرور پی لیا کرتے تھے۔ جسم پر صرف ہڈیاں رہ گئی تھیں اور ہڈیوں پر کھال لپٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے اور چہرے کی ہڈیاں اُبھر آئیں تھیں۔ اور داڑھی کے بال قلندرانہ بے باکی سے ہر طرف پھیل

گئے تھے۔ یہ سب کچھ تھا مگر آپ ہر وقت باہوش رہا کرتے تھے۔ جب بھی کوئی بات کرتا تو جیسے کہیں دُور سے آواز آرہی ہو اس کو تسلی بخش جواب دیتے تھے۔ آپ کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی رہتی تھیں اور چہرے پر اس قدر جلال طاری رہتا تھا کہ بات کرنے کے بڑے بڑوں کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں خادم تک سامنے نہ آپاتے تھے اور پیچھے سے لاکر پانی یا چائے منہ سے لگا دیا کرتے۔

اس زمانے کے واقعات شاہد ہیں کہ آپ کے منہ سے جو بات نکلتی تھی وہ حق کا فرمان ہوتی تھی۔ کسی کو اگر کسی سے عداوت ہوتی اور اپنے دشمن کی بربادی چاہتا تو وہ خادموں سے دوستی کرکے باباصاحب کے منہ سے کہلوا دیتا تھا کہ فلاں مر جائے گا۔ ادھر بابا صاحب کی زبان سے بات نکلتی تھی اور اُدھر اس کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ کبھی کسی نے اپنی غربت کی شکایت اور دھن دولت کے لئے کہلوا دیا تو چند ہی روز میں اس کے یہاں دولت امنڈنے لگتی۔ چاہے وہ دولت اس کے لئے مفید نہ ہوتی مگر ہوتا ایسا ہی تھا۔ جذامی، کوڑھی، لاولد ہر کسی کا بغیر سوچے سمجھے چٹ پٹ معاملہ ہو جاتا۔ مگر اس زمانہ میں لوگ آپ سے بہت ڈرتے تھے۔ سامنے اگر آ بھی جاتے تو ان پر ایسی ہیبت طاری ہوتی کہ دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی اور منہ سے آواز تک نہ نکلتی۔

اسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے۔ سردیوں کا زمانہ تھا باباصاحب اپنی جھونپڑی میں شال اوڑھے ہوئے لیٹے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ آپ نے محسوس کیا کہ دائیں پائوں کے انگوٹھے کی جڑ میں کسی چیز نے کاٹا ہے۔ آپ نے پیر جھٹک دیا اور بغیر اُٹھے ہوئے پیروں کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا کالا سانپ جھونپڑی کے دروازے سے نکل کر باہر چلا جارہا ہے۔ آپ نے کسی سے کچھ نہ کہا اور سڑک کے پار دھوبی گھاٹ کے پاس جو بڑی چٹان تھی اس پر جاکر لیٹ گئے۔ آپ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا اور غنودگی چھا گئی۔ خادموں نے یہ سوچا کہ شاید آرام کر رہے ہیں مگر تھوڑی ہی دیر میں جب یہ دیکھا کہ منہ اور ناک سے ہرے اور نیلے جھاگ نکل رہے ہیں تو سمجھ گئے کہ کسی سانپ نے کاٹا ہے۔ فوراً آس پاس جنگل سے کچھ دھوبیوں اور چرواہوں کو بلالائے۔ انہوں نے جسم کو ٹٹولا اور انگوٹھے کے نیچے ایک نشان دیکھا، آنکھیں کھول کر دیکھیں پُتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ جبڑے بند تھے اور بدن سخت ہو چلا تھا۔ خادم چٹان پر سے اُٹھالائے اور جھونپری میں شال اُڑھا کر لٹادیا۔ خادم اس کے سوا اور کر بھی کیا کر سکتے تھے۔ نہ کسی ڈاکٹر کو بلا سکتے تھے نہ کوئی اور ترکیب ان کی سمجھ میں آتی تھی۔ بیچارے نہایت ہی مغموم اور متفکر جھونپڑی کا دروازہ بند کرکے بیٹھ گئے۔ شام کے چار بجے کے قریب باباصاحب نہایت پُھرتی کے ساتھ اُٹھے اور باہر نکل آئے۔ گویا انہیں کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ علاوہ ان دانتوں کے نشان کے جو انگوٹھے کے نیچے تھے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ آپ کو بہت غصہ آیا اور فرمانے لگے کہ اس بدتمیز کے میں ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ کوئی تین مہینہ کے بعد گرمیوں کے شروع میں صبح کے وقت جب ضروریات سے فارغ ہو کر واپس تشریف لارہے تھے تو کیا

دیکھا کہ ایک چھ فٹ کا لمبا کالا ناگ جھونپڑی کے برابر لیٹا ہوا تھا۔ اوپر چیونٹے اس کے منہ پر چمٹے ہوئے تھے۔ بابا صاحب نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور کہا۔ ''تو ہے آپ ہی مر گیا۔'' اور لوگوں کو بلوا کر سے جلوا دیا۔

عاشقانِ دین کے رمز کو سمجھنا اور ان کے بھید کا پانا بہت ہی دشوار ہے۔ کیا حق نے سانپ کو اس لئے بھیجا اور کٹوایا کہ دیکھیں میرے عاشق کی توجہ موت کی طرف جاتی ہے جو سامنے کھڑی ہے یا مجھ سے وابستہ رہتی ہے۔ اور یہ کہ اس کی نگاہ اسباب پر جاتی ہے یا سبب الاسباب پر۔ عاشق کو کن کن سخت آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ آزمائش کی ضرورت کیا تھی۔ کیا حق کو یہ معلوم نہیں ہے کہ میرا کون سا بندہ کس حالت میں کیا کرے گا اور اس کا انجام کیا ہو گا۔ پھر بابا صاحب کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ کیا تربیت تھی؟

روح کی نشوونما کے لئے جسم کی تکلیف اور مصیبتیں ضروری ہیں۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ماں پر قیامت گزرتی ہے۔ تسلسل نسلِ فطرت کا عظیم ترین ارادہ ہے جس کی حفاظت کے لئے فطرت کیا کیا تدبیریں کرتی ہے مگر ان تمام تدبیروں کے باوجود جب ایک نئی جان وجود میں آتی ہے تو وہ منظر قیامت خیز ہوتا ہے۔ ہر جاندار خوشی اور راحت کی طرف دوڑتا ہے۔ گویا خوشی اور حیات ہم معنی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ غم والم اور یہ اذیت کیسی۔ نہیں نہیں۔ خوشی اور ہنسی تو بلبلے ہیں جو سطح آب پر نظر آتے ہیں۔ مٹی کی آنکھیں رازِ حیات کی سطح سے نیچے نہیں دیکھ سکتیں۔ غم اور صرف غم ہی کے ذریعہ انسان اپنی گہرائیوں کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ دنیا کا غم نہیں، دنیا کا غم دنیا کی خوشی کی طرح ایک پرچھائیں اور آنی جانی چیز ہے۔ نہ اسے دوام ہے نہ قیام۔ وہ غم جس کے متعلق مولانا روم نے فرمایا ہے۔

از نیستاں چوں مرا ببریدہ اند

از نفیریم مرد وزن نالیدہ اند

(جب سے مجھے لے کر جنگل سے کاٹ کر جدا کر دیا گیا ہے۔ نالہ وفغاں سے مرد وزن روتے ہیں)

یہ غم ایک سمندر ہے۔ اس میں ڈوب کر انسان اپنی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ حُسنِ مجرد نے عالم کی تخلیق کی اور دیکھا تو ہر طرف حُسن ہی حُسن تھا۔ مگر یہ کائنات رب ذوالجلال کے شایانِ شان نہ تھی۔ اسی لئے آدم کی تخلیق کی۔ بات یوں بھی تھی کہ حُسن کی یہ صفت ہے کہ وہ صرف اپنے ہی آپ کو دیکھے۔ گو اسے فطرت نے عالم کا آئینہ بنایا۔ پھر بھی یہ حُسن رب ذوالجلال کی عکاسی نہیں کر سکا۔ آدم نے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے جواب میں بَلٰی کہہ کر بڑا ظلم کیا۔ خالق کُل نے آدم کی طرف دیکھا تو وہ اپنے ہی حُسن پر فریفتہ ہو گیا۔

اور اُس نے معشوق کو ایک ایسی شے تحفہ میں پیش کرنی چاہی جو اپنی شایانِ شان ہو۔ یہ شے کائنات کی کسی چیز میں نہ تھی۔ مگر انسان کے قلب میں موجود تھی۔ وہ اس سے بے خبر تھا۔ اس شے کو قدرت نے سنوار کر اور سجا کر آدم کے سامنے پیش کیا۔ آدم نے جب اسے بے نقاب دیکھا تو اس میں گم تھا، وہ چیخ اُٹھا۔

آسمان بارِ امانت نہ توانست کشید

قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند

(آسمان خدا کی امانت کے بوجھ کو نہ اُٹھا سکا تو مجھ دیوانے (انسان) کے نام پر قرعہ نکلا اور مجھے یہ امانت سونپ دی گئی)

اس یار کے چاہنے والوں کو اس یار کی کچھ پہچان نہیں

وہ آنکھ نہیں جو دیکھ سکے، انسان تو ہے انسان نہیں

بیکار ہے بھگتوں ی پوجا اور بدھی مان کی سب سکھشا

وہ وید قرآن کا بھید نہیں وہ دھرم نہیں ایمان نہیں

کچھ دور کی کوڑی لاتے ہیں کچھ اونچے محل اٹھاتے ہیں

وہ من کٹیا میں بیٹھا ہے کچھ ساز نہیں سامان نہیں

کچھ اس میں اس کو ڈھونڈتے ہیں کچھ اس سے باہر ڈھونڈتے ہیں

وہ اندر باہر ظاہر ہے وہ جسم نہیں وہ جان نہیں

جو دیا جوت جگاتے ہیں اور دن کو رات بناتے ہیں

ان سورج دیکھنے والوں کو اس سورج کا کچھ گیان نہیں

بے انت کو انت کہاں پائے بے انت سے انت کہاں جائے

سب پریم کی لیلا لیلا ہے وہ رام نہیں رحمن نہیں

جو ہر کو سیس نواتے ہیں اور ہر ہی کے ہو جاتے ہیں

وہ ہر میں ہر کو پاتے ہیں ہر پنڈت جی کا مان نہیں

(رحمن بابا)

☆...☆...☆